سانحۂ اقصیٰ

سید ابوالاعلیٰ مودودی



اردو ڈیجیٹل لائبریری

اس پلیٹ فارم سے جاری ہونے والی تمام کتابیں صرف مطالعہ اور تحقیقی مقاصد کیلئے پیش کی جاتی ہیں۔

اردو ڈیجیٹل لائبریری کے واٹس ایپ اور ٹیلیگرام چینل میں شامل ہو کر بہترین کتب سے لطف اندوز ہوں۔


/urduDigitalLibrary


+92-336 300 2000

مطالعہ کتب کیلئے کتاب / مصنف کا نام لکھ کر واٹس ایپ کریں۔

ان کتب کو تجارتی مقاصد کیلئے استعمال کرنا شرعی، اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔

مصنفین اور ناشرین کا بنیادی حق ہے کہ کتب خرید کر استعمال کی جائیں۔





سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ
اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ
اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝۱ [بنیٓ اسرآئیل ۱:۱۷]

پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے
دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے تاکہ
اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے
سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا

ترتیب

کل اور آج

کسی گھر پر ڈاکو قبضہ کرلیں تو مزاحمت اور واگزاری کی کوشش تمام اہل خانہ کا حق اور فرض ہوتا ہے۔ لیکن فلسطین اور کشمیر پر یہ منطق مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ نہ صرف مزاحمت چھوڑ دیں' بلکہ دل سے بھی تسلیم کرلیں کہ یہ گھر اب ڈاکوؤں کا ہوگیا۔ بعض ناخلف افرادِ خانہ کو گھر کا ایک آدھ کمرہ یا صرف راہداری دے کر یہ منوایا جارہا ہے کہ بس یہی پورا گھر ہے۔ باقی سب غیر کی ملکیت ہے۔ ڈاکو اور ان کے سرپرست پورے کنبے میں سے صرف انھی ''باضمیر'' افراد کو جینے کا حق دے رہے ہیں' باقی سب دہشت گرد ہیں (صدر بش نے اُردن میں اپنی تقریر میں محمود عباس کو صاحبِ ضمیر قائد کا لقب دیا ہے)۔ اب انھی ''باضمیروں'' کو اپنے بھائی بندوں کے قتلِ عام پر لگایا جارہا ہے۔ پوری دنیا اس عدلِ عالمی پر تحسین کے ڈونگرے برسا رہی ہے۔ مظلوم گھرانے کے باقی تمام عزیز و اقارب سے بھی یہ گردان شروع کروا دی گئی ہے کہ ''جب گھر کے اصل مالکوں نے ڈاکو کو مالک تسلیم کرلیا ہے تو ہم کیوں نہ کریں''۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں کہ معاملہ کسی عام گھر کا نہیں' محبُوب کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جائے امامت و معراج کا ہے جو خانہ خدا سے پہلے دنیا بھر میں پھیلی مسلم اُمت کا قبلہ تھا۔ اسے مفاد کے چند بندوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟

پوری دنیا میں ایک ہی راگ الاپا جارہا ہے کہ مسئلہ فلسطین حل ہوگیا۔ راگ الاپنے والے سب سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ روڈمیپ اور امن معاہدے' صہیونی دفاعی اقدامات

کا ایک حصّہ ہیں۔ صیہونی افواج ہر ہتھکنڈہ استعمال کر لینے کے باوجود ستمبر ۲۰۰۰ء میں شروع ہونے والی دوسری تحریکِ انتفاضہ کو کچلنے میں ناکام رہیں تو اب خود فلسطینیوں کو یہ ہدف دے دیا گیا ہے۔ بہائی مذہب رکھنے والے محمود عباس (ابو مازن) صرف اسی لیے ''تمام تعریفوں کے لائق'' قرار دیے جا رہے ہیں کہ وہ فلسطینیوں کی ''عسکری سرگرمیوں'' کے مخالف ہیں۔ امریکی صدر کے حالیہ دورہ مصر و اُردن کے دوران ابو مازن نے خود شارون سے بھی زیادہ ''فلسطینی دہشت گردی'' کی مذمت کی' اس سے بڑھ کر ''پوری انسانی تاریخ میں یہودیوں پر توڑے جانے والے مظالم'' پر دکھ کا اظہار کیا' اور اپنا اصل ہدف اس امر کو قرار دیا کہ وہ شدت پسندی' دہشت گردی کرنے والوں اور یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلانے والوں یعنی یہودیوں کے قبضے اور ان کے مظالم کا ذکر کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔

اپنی پوری تقریر میں انھوں نے فلسطینیوں کے حق آزادی' لاکھوں کی تعداد میں بے گھر فلسطینی مہاجرین کی واپسی یا مسجد اقصیٰ کی بازیابی کی طرف ادنیٰ اشارہ نہیں کیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ابو مازن شارون معاہدہ ۲۰۰۰ء میں شروع ہونے والی دوسری تحریک انتفاضہ کو کچلنے میں ناکامی اور عراق پر امریکی قبضے کے بعد ہوا ہے۔ اس سے پہلے یاسر عرفات رابن معاہدہ ۸۷ء میں شروع ہونے والی پہلی تحریک انتفاضہ کو کچلنے میں ناکامی اور عراق کو تباہ کرنے کے بعد ہوا تھا۔ تب یاسر عرفات امن کے نوبل انعام کے حق دار ٹھہرے تھے۔ اب ابو مازن کو آنکھ کا تارا قرار دیا جا رہا ہے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں دوسری تحریکِ انتفاضہ کا آغاز اس وقت ہوا تھا' جب عرفات رابن معاہدے کے منطقی ہدف کو پورا کرتے ہوئے آریل شارون نے مسجد اقصیٰ میں گھسنا چاہا تھا۔ مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے وہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا قدیم صیہونی خواہش ہے۔ فلسطین میں گھسنے کے لیے عثمانی خلیفہ سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی بنیاد پر کی گئی تھی کہ ''یہودیوں کو وہاں عبادت کی اجازت دی جائے''۔ برطانوی استبداد کی چھتری تلے فلسطین

میں قدم جمانے سے لے کر امریکی سرپرستی میں لاکھوں فلسطینی عوام سے ان کی شناخت اور سایہ سلب کرنے کے تمام مراحل میں، یہودیوں کی اصل توجہ مسجد اقصیٰ پر رہی۔ اقصیٰ کو جلانے کی کوشش، نمازیوں پر فائرنگ کے لاتعداد واقعات، آثارِ قدیمہ کی تلاش میں مسجد اقصیٰ کی بنیادیں کھوکھلی کرنا، تیسرے ہزاریے کو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا خدائی عہد قرار دینا اور اب چالیس سال سے کم عمر کے تمام مسلمانوں کا مسجد اقصیٰ میں داخلہ ممنوع قرار دے دینا سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سیکڑوں صہیونی تنظیمیں اور ادارے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے مالی وفنی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس دوران میں نام نہاد امن معاہدے، عالم اسلام سے اسرائیل کے تعلقات، نئے مشرق وسطیٰ کا نقشہ سب بظاہر تنازعے کا حل ہیں لیکن عملاً یہ سب کچھ اسی وسیع تر صہیونی ریاست کی تکمیل کی جانب قدم ہیں جن کا ذکر ہزاروں صہیونی و صلیبی کتب میں کیا جا چکا ہے۔ تب برطانیہ نے ان تمام صہیونی منصوبوں پر عمل کیا، اب یہ ذمہ داری امریکہ نے اپنے سر لی ہے۔ تب جمعیت اقوام نے صہیونی قبضہ جائز قرار دیا، اب اقوامِ متحدہ اس قبضے کو مستحکم کر رہی ہے۔ تب عرب حکمرانوں کو عرب و عجم کا حکمران بنانے کا دھوکا دیا گیا اور اب خود فلسطین میں کئی سراب گزیدہ دستیاب ہیں۔

۱۹۶۹ء میں اسیر مسجد اقصیٰ کو جلا کر شہید کرنے کی مذموم کوشش کے وقت بانی جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس پورے صہیونی منصوبے کا احاطہ کیا تھا۔ یہ تقریر آج کے حالات پر بھی اسی طرح منطبق ہوتی ہے جس طرح آج سے ۳۴ سال پہلے تھی۔

مسلم اُمت کے لیے راستہ اب بھی وہی ہے جس کی طرف مولانا مرحوم نے اشارہ کیا، اور جو ہمیشہ سے ربِ کائنات کی سنت ہے، یعنی: ایمان، علم، اتحاد، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ۔

عبدالغفار عزیز

ناظم شعبہ امور خارجہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسجدِ اقصیٰ میں آتشزنی کی دلخراش خبر ہر مسلمان کے قلب و رُوح پر بجلی بن کے گری ہے اور صرف پاکستان ہی کے مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اُٹھے ہیں۔ اس وقت بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ایک طوفان کی طرح اُٹھ رہا ہے کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہے؟ یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ منحوس لمحہ ہماری زندگی میں پیش آیا۔ ۷۰، ۷۵ کروڑ۔

اب سو ارب مسلمان دُنیا میں موجود ہیں اور پھر بھی یہودیوں کی یہ ہمّت ہوئی کہ ہماری تین مقدس ترین مسجدوں میں سے ایک کو آگ لگا دیں، اُس مسجد کو پھونک ڈالیں جسے اسلام میں قبلۂ اوّل ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کی طرف رُخ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے ۱۴ برس تک نماز پڑھی ہے، اور جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے بڑی مصیبت اُمّتِ مُسلمہ کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ جس مسلمان کے دل میں دین کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے وہ سوچ رہا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو دنیا میں اس امت کی کیا آبرو باقی رہ جائے گی اور اس کے بعد ہمیں نہ معلوم اور کیسی ذلتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس معاملے کی پوری نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہئے۔

اس جُرم کا اصل محرِّک کیا ہے

اسرائیل نے اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی پے در پے کوششیں کی ہیں اور اس کے لیے بڑے اوچھے طریقے اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ بجلی کے تاروں میں خرابی واقع ہونے سے اتفاقاً آگ لگ گئی۔ لیکن پھر خود ہی ان مجرموں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ اتنی بڑی عمارت میں محض بجلی کے تاروں کی خرابی سے ایسی خوفناک آتش زدگی آخر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد نہایت ڈھٹائی اور سخت بے حیائی کے ساتھ یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ عربوں نے خود آگ لگائی ہے۔ اس طرح کے جھوٹ کا ہم کو پہلے ہی کافی تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کس قماش کے لوگ ایسے جھوٹ گھڑا کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی مدت پہلے اسی لاہور میں ہمارے دفتر پر حملہ کر کے قرآن جلایا گیا اور اُلٹا ہم پر ہی یہ بہتان لگا دیا گیا کہ قرآن انہوں نے خود جلایا ہے۔ جس فلسفے کے تحت یہ جھوٹ گھڑا گیا تھا اس فلسفے کے اصل مصنف یہودی ہی ہیں۔ وہ یہودی دماغ ہی تھا جس نے اخلاق کا یہ اصول تصنیف کیا تھا کہ جس طریقہ سے بھی مقصد براری ہو سکے وہ برحق ہے۔ یہودیوں کو بہت جلدی یہ محسوس ہو گیا کہ یہ دروغِ بے فروغ بھی کارگر نہ ہو گا۔ اب ایک آسٹریلین نوجوان کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس دیوانے نے کسی جنون کے دَورے میں یہ حرکت کر ڈالی ہے ورنہ مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کرنے کا کوئی منصوبہ اسرائیل کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نوجوان پر مقدمہ چلا کر اور اپنے ایک خود ساختہ کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کرا کے وہ اپنے جُرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کی پوری تاریخ بیان کر دوں جس سے

آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک بڑا طویل المیعاد منصوبہ ہے جو صدیوں سے چل رہا ہے اور اسی کے تحت یہ کارروائی بطور تمہید کی گئی ہے۔

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور وہ صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتلِ عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سُرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے، بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبلِ مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر چھٹی صدی قبلِ مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور ہیکل سلیمانی (Temple of Solomon) کو، جسے دسویں قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السّلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوند خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلا وطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ ۷۰ عیسوی میں

یہودیوں نے رُومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا، اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کُچل کر ۱۳۵عیسوی میں رُومیوں نے پُورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اُسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا، بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا، اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

(۱) یہودی ابتداءً نسل کُشی (Genocide) کے مُرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

(۲) شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

(۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔

(۴) عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبلِ مسیح میں انہوں نے کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکلِ سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے

کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جارہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارہویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعت یہود (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ "ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرے۔" مشہور فری میسن تحریک بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے، اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کرے، اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ عیسوی میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں

نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرلیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے، ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم وستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارِ گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیل حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن (News from Israel) شائع ہوتا ہے اس کی یکم جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوارِ گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ ۱۶ ویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کر کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت، فیاضی اور حسنِ سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس

کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل نے ۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔

پھر ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی) کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ ''جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں''۔ جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام تھا حاخام قرہ صوآفندی۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا بُرا نتیجہ دیکھو گے۔

چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں شروع ہوگئیں جن میں فری میسن، دونمہ اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ

۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر اُن کے پاس گئے تھے اُن میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات ہی برس پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور و شور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنیاد اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں، حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کُرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جد و جہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا، اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے

سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور

پہلی جنگ عظیم میں ابتداء یہودیوں نے حکومت جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا، کیونکہ جرمنی میں اُس وقت یہودیوں کا اُتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوا دے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین (Dr. Weizman) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت وقابلیّت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آ سکتی ہے اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی خودمختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔

پھر ذرا غور کیجئے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا

فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جارہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آرہی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فیصدی بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنت برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا جو دنیا بھر میں ۱۹ سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمہیں موقع دیں گے کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اُس سے تم اُنھی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے؟

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے اُن سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اُس قدیم سرزمین میں اِس وقت آباد ہیں۔"

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of British Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔

مجلسِ اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دَور شروع ہوا جس میں مجلسِ اقوام (League of Nations) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں، برطانیہ اور فرانس نے بالکل اِس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صہیونی

تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے انتداب[۲] (Mandate) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۱۴۶۴، اور یہودی ۸۲۷۹۰ تھے، اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے[۳]۔ اس پر بھی مجلسِ اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے، صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم و نسق میں شریک کرے، اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔

یہ تھا اس مجلسِ اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت دُنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسِ اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیمویل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سُپرد نہ صرف تعلیم

اور زراعت کے محکمے کیے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیئے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید براں اُن کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقادی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نو آبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیئے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیئے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۸ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس تین پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صیہونیت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا، اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب کی ناک کے نیچے

یہودیوں کو ہر طرح کی ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ''قومی وطن'' بنانے کے بجائے فلسطین میں ان کی ''قومی ریاست'' قائم کر دیں۔

''قومی وطن'' سے ''قومی ریاست'' تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صہیونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوامِ متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن و انصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیوشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے، اور جیمز فوریسٹال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک

کارروائی (Scandal) کی حدتک پہنچے ہوئے تھے"۔

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رُو سے فلسطین کا ۵۵ فی صدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو، اور ۴۵ فی صدی رقبہ ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا، حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے، آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (Astudy of History) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اُن مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیر یاسین میں ۹ اپریل ۴۸ء کے قتلِ عام کا خاص طور پر اُس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا، عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ "ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ"۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہوسکتا ہے جس میں رمق برابر بھی شرافت و انسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۴۸ء کو عین اُس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر پھر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا، اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۶ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے

بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردوپیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ لیکن یہودی اُس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصّہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے، اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیا سے آئے تھے جو آج خود ظلم و ستم کا شکار ہے۔ اقوامِ متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس اور پورے باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحد شام کی بالائی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔

نومبر ۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہو گیا اور ۱۴ '۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن

گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکہ اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید وحمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۵۵ء تک علانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۵۵ء میں جب عرب ممالک اس بات سے بالکل مایوس ہو گئے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انہیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انہیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے ''کرہ'' اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہو سکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن تک اور عراق سے الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہو گیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے اُلجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدّت میں امریکہ نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا۔ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زِفرق تا بقدم اس قدر مسلّح کر دیا گیا کہ جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ ڈالے گا۔

سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھ اس کی پشت پناہی کرتے

رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوامِ متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۴۷ء سے ۵۷ء تک اقوامِ متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ اُس کے منہ پر مار چکا تھا۔ ستمبر ۴۸ء سے نومبر ۶۶ء تک ۷ مرتبہ اقوامِ متحدہ نے اس کے خلاف مذمّت کی قرار دادیں پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اُس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ "اگر اقوامِ متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہ نکلیں گے"۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر پر مارتا ہے اور اقوامِ متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکہ کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اُس رویّے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے رُوس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر "وحی" نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے ساحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ

مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیّارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لنڈن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (The Holy War, June 67)۔ اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے (Back After 896 Years) یعنی ''۸۹۶ برس کے بعد واپسی''۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصّہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات کو رُوس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا! عربوں کے ساتھ روس کے رویّے پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے''۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰

سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزا دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجدِ اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اُس پُورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزا کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اُسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامّل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام کے شدید ردّ عمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیرِ نو مسیح ہی آ کر کرے گا، جب تک وہ نہ آ جائے ہمیں انتظار کرنا چاہئے ۵۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو جدّت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دَورِ مسیحائی (Messianic Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربّی ۶ نے توراۃ ہاتھ میں لے کر اُس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ ''آج ہم ملّتِ یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں''۔ انہی دو وجوہ سے مسجدِ اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِّ عمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جُزو اِس منصوبے کا یہ ہے کہ ''میراث کے ملک'' پر قبضہ کیا جائے۔ یہ

میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''اَے اسرائیل، تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں''۔

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلاّ دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اِس طرح عَلانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صہیونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پُورا اُردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصّہ، ترکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سُنیے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دُنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِّعمل بھی مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوسکا، تو پھر خاکم بدہن ایک دن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پُورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں گے۔

پس چہ باید کرد؟

حضرات، اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیش نظر مسئلے کی پوری نوعیّت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

اوّل یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور اُن کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیّر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکہ کی پُشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جُرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا

ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطر مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کرسکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کردی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصیٰ، بلکہ مدینۂ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت، اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کردینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدّت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مسجدِ اقصیٰ کے سانحے سے ان کی آنکھیں بھی کھُل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صیہونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ، جبکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید و حمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ۶۰ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ۷۰، ۷۵ کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں، اور ان کی ۳۰، ۳۲ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پُشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کرلینا، انشاءاللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اصل مسئلہ محض مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلّط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے، صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں، باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انہیں واپس جانا چاہئے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیئے خطرہ ہے۔ اور عالمِ اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بنی چاہیے جس میں ملک کے پُرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور پھر قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکہ، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی

حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو رُوئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اُس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبۂ خیرسگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔



حواشی

۱۔ یہ وہ یہودی تھے جنہوں نے ریاکارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں۔

۲۔ انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطور خود کسی ملک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلسِ اقوام کی طرف سے اس کے سپرد کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

۳۔ ۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

۴۔ اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر ''وحی'' کیا کرتے ہیں۔

۵۔ واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح (Promised Messiahy) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسیحِ دجّال قرار دیا ہے۔

۶۔ جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربّی ہوتے ہیں، اور ان کے چیف ربّی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈ جنرل کا رینک حاصل ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض **مسجدِ اقصٰی** کی حفاظت کا نہیں ہے۔ **مسجدِ اقصٰی** محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المَقدِس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے، صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں، باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انہیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے۔ (ص ۳۰، سانحۂ اقصٰی)